الشریعہ اور ہائیڈ پارک

ہمارے انتہائی مہربان اور فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کی زیر ادارت لاہور سے شائع ہونے والے اہم علمی وفکری جریدہ ماہنامہ ''البرہان'' کے ستمبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں جامعہ ہمدرد کراچی کے ایک فاضل بزرگ جناب فصیح احمد کا مضمون ''تارِ عنکبوت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے مولانا وحید الدین خان کے بعض افکار کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور اس میں ''الشریعہ'' کی پالیسی کے حوالہ سے بھی کچھ ارشاد فرمایا ہے جو درج ذیل ہے:

''ایک بات ہم مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض کرنا چاہتے ہیں کہ البرہان ایک نظریاتی، تحقیقی اور علمی رسالہ ہے لہٰذا اس رسالے میں مضامین کا چناؤ اور مضامین کی اشاعت کے حوالہ سے بھی علمی تحقیقی رویہ اپنانا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ قارئین کو علمی وفکری انتشار سے بچایا جائے۔ انتشار ذہنی سے بچنے کے لیے اس بات کی کوشش کی جائے کہ ایسے گمراہ کن اور غیر علمی مضمون کو رسالے میں چھاپنے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی مصلحت کے تحت کبھی شائع کرنا ضروری ہو تو پہلے کسی اہل علم کو وہ مضمون بھجوا دیا جائے اور ان سے جواب لکھوایا جائے۔ مضمون کا جواب ملنے کے بعد اس مضمون کے ساتھ اس جواب کو بھی شائع کر دیا جائے تاکہ قارئین دونوں کے موقف کو سامنے رکھ کر رائے قائم کر سکیں، کیونکہ بسا اوقات قاری ایک ماہ کا رسالہ پڑھنے کے بعد دوسرے ماہ اس کا جواب کسی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تو اس قاری کے فکری انتشار یا گمراہی کا ذمہ دار کون ہوگا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ قارئین البرہان کو علمی وفکری انتشار سے بچانے کا اس سے بہتر اور مناسب کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ البرہان کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے۔ دینی علمی رسالوں کو ہائیڈ پارک میں تبدیل کرنے کا کام مولانا زاہد الراشدی صاحب نے الشریعہ کے ذریعہ بخوبی انجام دیا ہے۔ دنیا بھر کی غلط سلط تحریریں نہایت کروفر کے ساتھ الشریعہ میں شائع ہوتی ہیں۔ انتشار پھیلانے کے اس عمل کو وہ آزادانہ رائے اور علمی ترقی کہتے ہیں۔ موصوف جاوید غامدی صاحب کے نظریات اپنے صاحبزادے کے سائے میں پھیلانے کا کام کر رہے ہیں، تجدید دین کے نام پر تجدد عام ہو رہا ہے۔''

''الشریعہ'' کے بارے میں جناب فصیح احمد کے ارشادات پر کچھ معروضات پیش کرنے سے پہلے ہم ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے علمی وفکری مسائل پر باہمی تبادلۂ خیالات اور مباحثہ ومکالمہ کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ دونوں طرف کے مضامین کو ایک ہی فورم پر شائع کرنے کی ضرورت بیان کر کے ہمارے اس موقف کی اصولی طور پر تائید فرما دی ہے کہ علمی وفکری مسائل پر مکالمہ ومباحثہ ہونا چاہیے اور کوئی ایسا فورم بھی ضرور موجود ہونا

چاہیے جہاں کسی مسئلہ پر مختلف موقف رکھنے والے دو یا دو سے زائد فریقوں کا موقف یک جا شائع ہوتا کہ قارئین کو سب لوگوں کا موقف سامنے رکھ کر رائے قائم کرنے میں آسانی رہے۔ الشریعہ گزشتہ ربع صدی سے یہی خدمت سرانجام دے رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہماری پالیسی پر ناقدانہ نظر رکھنے والے علمی حلقوں میں بھی اس کی اہمیت وضرورت کا احساس پیدا ہو رہا ہے، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

البتہ محترم جناب فصیح احمد کے ان تحفظات کے حوالہ سے کچھ عرض کرنا بھی ضروری ہے جن کا اظہار انہوں نے اس ارشاد گرامی میں کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے فرمایا ہے کہ الشریعۃ نے ''ہائیڈ پارک'' کا کردار ادا کرنا شروع کر رکھا ہے۔ ہمارے خیال میں انہیں اس تشبیہ کے لیے لندن کا طویل سفر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لاہور کا ''موچی دروازہ'' ان کے جذبات کے اظہار کے لیے کافی تھا۔ باغ بیرون موچی دروازہ یا ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونے والے مذہبی اور سیاسی جلسوں میں ہمارے ہاں ایک دوسرے کے خلاف جو زبان استعمال ہوتی آ رہی ہے، اسے سامنے رکھتے ہوئے ''ہائیڈ پارک'' کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ہم اس معاملہ میں خود کفیل نظر آتے ہیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ ''الشریعہ'' میں گزشتہ ربع صدی کے دوران شائع ہونے والے بہت سے مضامین کی زبان ''ہائیڈ پارک'' اور ''موچی دروازہ'' سے مختلف نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زبان کس نے استعمال کی ہے؟ اگر یہ زبان اور لہجہ واسلوب ''الشریعہ'' کی طرف سے اختیار کیا گیا ہے تو ہم مجرم ہیں۔ جناب فصیح احمد الشریعہ کی گزشتہ فائلیں چیک کر کے جہاں جہاں نشان دہی کریں گے، ہم اس پر کھلے دل سے معافی مانگیں گے۔ لیکن اگر ایسے مضامین ہم نے خود جناب فصیح احمد کی بیان کردہ ضرورت کے مطابق جوابی موقف کے طور پر مجبوراً شائع کیے ہیں تو اس کا بار ''الشریعہ'' پر ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ہماری یہ معاشرتی مجبوری بن گئی ہے کہ ہم علمی، فکری اور تحقیقی مباحث میں بھی (چند مستثنیات کے ساتھ) ہائیڈ پارک کی زبان بولنے اور موچی دروازے کا لہجہ واسلوب اپنانے کے عادی ہیں۔ ''الشریعہ'' اسی منفی معاشرتی رویے کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ارباب علم وفضل کے عمومی ماحول کو یہ احساس دلانے کی سعی میں مصروف ہے کہ علمی وفکری مسائل میں علمی وفکری اسلوب اور زبان اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب فصیح احمد جیسے اصحابِ دانش پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ ''ہائیڈ پارک'' میں کھڑے لوگوں سے تو کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے، ہیں لیکن انہیں ''ہائیڈ پارک'' کے ماحول سے باہر آنے کی دعوت دینے والوں پر ان کی ناراضگی کا سارا نزلہ گر رہا ہے۔

رہی بات مضامین کے معیار اور انتخاب کی تو اس سلسلہ میں دو باتیں قابل توجہ ہیں، ایک یہ کہ ہم متعدد بار ''الشریعہ'' کے صفحات میں یہ اپیل کر چکے ہیں کہ مضمون نگار حضرات علمی وتحقیقی لہجہ میں بات کریں اور باہمی الزام تراشی اور طعن و تشنیع سے گریز کرتے ہوئے علمی انداز میں اپنا موقف بیان کریں۔ ہماری اس اپیل کا دھیرے دھیرے اثر ہو رہا ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ پہلے سے ''افاقہ'' دکھائی دینے لگا ہے۔ لیکن اس میں بہرحال وقت لگے گا اور ہمیں امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ علمی مباحث میں علمی زبان واسلوب کا ماحول عام کرنے میں ضرور کامیابی ہوگی۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ایک طرف کا موقف شائع ہوا ہے تو دوسری طرف کا موقف شائع کرنا بھی ضروری ہے، لیکن وہ موقف ایسے لہجے اور اسلوب

میں ہے کہ جناب فصیح احمد صاحب کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو ہماری ترجیح یہ ہوتی ہے کہ زبان واسلوب کی کمزوری کو نظر انداز کرتے ہوئے موقف کو شائع کر دیا جائے، ہوسکتا ہے دونوں مضامین کے تقابل میں خود صاحب مضمون کو اس بات کا احساس ہو جائے۔

دوسری بات یہ کہ کن عنوانات پر بات ہونی چاہیے اور کن موضوعات کو نظر انداز کر دینا چاہیے؟ ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام کی تعبیر وتشریح اور نفاذِ اسلام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں عالمی اور قومی سطح پر جو امور زیر بحث آتے ہیں ان پر بات ضرور ہونی چاہیے اور مختلف علمی مکاتب فکر کے نقطۂ نظر کو قارئین کے سامنے آنا چاہیے۔

ہماری ایک معاشرتی اور نفسیاتی مجبوری یہ بھی ہے کہ وقت کی ضروریات کا تعین اپنے اپنے دائروں میں ہم خود ہی کر لیتے ہیں، حالانکہ وقت نہ اپنی رفتار میں ہمارا انتظار کر رہا ہوتا ہے اور نہ اپنی ضروریات کا تعین ہم سے پوچھ کر کرتا ہے، اس کی رفتار بھی اپنی ہوتی ہے اور ضروریات کا دائرہ بھی اپنا ہوتا ہے، مگر ہماری الجھن یہ ہے کہ جو بات ہماری ترجیحات میں شامل ہو جاتی ہے وہ وقت کی ضرورت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، اور جو عنوان یا موضوع ہماری ذاتی یا گروہی ترجیحات کا حصہ نہیں بن پاتا، اسے ہم سرے سے وقت کی ضروریات کے دائرے سے خارج قرار دینے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں بسا اوقات عجیب وغریب لطیفے رونما ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے ہاں یہ بحث چلی کہ گستاخ رسولؐ کے لیے توبہ کی گنجائش ہے یا نہیں؟ ملک کے علماء کرام نے عمومی طور پر یہ موقف اختیار کیا کہ موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ ہم نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا، لیکن جب اس بات کو علمی موقف کے طور پر بیان کیا جانے لگا تو یہ کہا گیا کہ احناف کا موقف بھی یہ ہے۔ ہم نے اس سے اختلاف کیا اور عرض کیا کہ احناف کا متفقہ موقف یہ نہیں ہے اس لیے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام ابو جعفر طحاویؒ نے گستاخ رسولؐ کے لیے صراحتاً توبہ کی گنجائش لکھی ہے جبکہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس پر مستقل رسالہ تحریر کیا ہے کہ گستاخ رسولؐ کے لیے توبہ کی گنجائش کا نہ ہونا احناف کا متفقہ موقف نہیں ہے۔ اس لیے اگر حالات کے تقاضے کے تحت اس موقف کو اختیار کرنا ضروری ہو تو اس میں مضائقہ نہیں، لیکن اسے احناف کا متفقہ موقف نہ کہا جائے۔ اس پر ہمارے بہت سے دوست چیں بہ جبیں ہوئے اور بعض احباب نے تو چائے کی پیالی میں طوفان کھڑا کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ ایک انتہائی مہربان اور صاحب علم دوست نے ذاتی ملاقات میں ہم سے فرمایا کہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے، مگر اسے اس وقت بیان کرنے اور لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، ہم نے عرض کیا کہ اگر اس وقت ضرورت نہیں تھی تو احناف کے موقف کی صحیح پوزیشن بیان کرنے کی ضرورت کیا قیامت کے دن پیش آئے گی؟

اسی طرح یہ مسئلہ کہ کیا پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے ہتھیار اٹھانا درست ہے یا نہیں؟ ہم ایک عرصہ سے گزارش کر رہے ہیں کہ نفاذِ اسلام کی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس کے لیے پرامن جدوجہد کا ہر حربہ اختیار کرنا ہمارے لیے دینی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ہتھیار بدست ہو کر اس مقصد کے لیے عسکری جنگ لڑنا درست نہیں ہے۔ اس پر ہمارے ایک انتہائی مہربان دوست جن کی دینی وجہادی خدمات کے ہم ہمیشہ معترف رہے ہیں، دور دراز سفر کر کے

گوجرانوالہ تشریف لائے اور بڑے خلوص وخیر خواہی کے ساتھ فرمایا کہ آپ کا موقف درست ہوسکتا ہے، لیکن اس کے اظہار کا وقت یہ نہیں ہے، اس لیے ابھی اس بارے میں خاموشی اختیار کر لیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے بھائی! اس وقت نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں اس موضوع پر بحث جاری ہے کہ نفاذِ اسلام کے لیے عسکری جدوجہد جائز ہے یا نہیں؟ اس لیے میرے خیال میں یہی وقت ہے کہ ہم اپنے موقف کا وضاحت کے ساتھ اظہار کریں۔ آپ ہمارے موقف سے اختلاف کریں، لیکن ہمیں اپنے موقف کے اظہار کے حق سے تو محروم نہ کریں۔

اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی کی وفات پر منعقد ہونے والی مجالس میں حاضری میرا معمول نہیں ہے، اکثر اوقات معذرت کر دیتا ہوں، لیکن اگر کہیں عمومی دینی مصلحت کے پیش نظر شریک ہونا ضروری ہو جاتا ہے تو وہاں اپنی گفتگو میں یہ وضاحت کر دیتا ہوں کہ اس قسم کی مجالس محض رسمی ہوتی ہیں، ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ اگر انہیں شرعی حیثیت دی جائے تو یہ بدعت کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں یہ بات میں نے قدرے وضاحت سے بیان کی تو ایک دوست نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ لوگ غم کے لیے جمع تھے، یہاں یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے عرض کیا کہ کیا یہ بات مجھے شادی کی کسی محفل میں بیان کرنی چاہیے تھی؟ میرے بھائی! بات وہیں کہی جائے گی جو اس کا موقع ہوگا اور جہاں اس کی ضرورت ہوگی۔

اس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ اسلام کے حوالے سے عالمی اور ملکی سطح پر یا معاشرتی ماحول میں جس مسئلہ پر گفتگو چل رہی ہو یا جو سوال سامنے آ جائے، اس پر اظہار خیال اہل دین کی ذمہ داری بن جاتا ہے اور کسی موضوع سے یہ کہہ کر گریز کرنا درست نہ ہوگا کہ وہ ہماری گروہی یا مسلکی ترجیحات میں شامل نہیں ہے، البتہ ایک دوسرے کے موقف اور دلائل سے ضرور واقف ہونا چاہیے اور موقف کے اظہار کے لیے زبان اور اسلوب ولہجہ کو متوازن رکھنا چاہیے۔

محترم فصیح احمد صاحب نے جناب جاوید احمد غامدی اور ان کے حلقۂ فکر کے بعض احباب کے مضامین کی ''الشریعہ'' میں اشاعت کا ''طعنہ'' بھی دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر صرف ان مضامین پر پڑی ہے اور انہی صفحات میں ان کے جواب میں شائع ہونے والے بیسیوں مضامین ان کی نظر کی توجہ حاصل نہیں کر سکے۔ حالانکہ غامدی صاحب کے بہت سے افکار پر متعدد اصحابِ قلم نے ناقدانہ قلم اٹھایا ہے اور ''الشریعہ'' نے تفصیل واہتمام کے ساتھ انہیں شائع کیا ہے۔ خود راقم الحروف کے ایک درجن سے زائد مضامین ''الشریعہ'' میں شائع ہوئے ہیں جن میں غامدی صاحب کے افکار پر نقد کیا گیا ہے، حتیٰ کہ عمار خان سلّمہٗ نے بھی (جسے غامدی صاحب کے افکار کے فروغ کا ذریعہ قرار دینے کی ''زیادتی'' جناب فصیح احمد صاحب نے بھی بلا تکلف فرما دی ہے) ''الشریعہ'' کے انہی صفحات میں غامدی صاحب کے متعدد افکار سے اختلاف کیا ہے اور ان پر ''علمی نقد'' کیا ہے، مگر یک طرفہ مطالعہ کے خوگر دوستوں کو یہ سائیڈ دکھائی ہی نہیں دیتی اور وہ یک طرفہ طور پر **ان یحدث بکل ما سمع** کا ورد کیے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے ہاں شوقین مزاج نوجوان ''یوم آزادی'' یا دوسرے مواقع پر جب زیادہ موج میں ہوتے ہیں تو موٹر سائیکلوں کے سائلنسر اتار کر ''ون ویلنگ'' کرتے ہوئے گلیوں بازاروں میں شہریوں کی قوت سماعت کا امتحان لینا شروع کر دیتے

ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ علمی اور دینی مباحث اس ماحول سے باہر نکلیں اور ہم جب کسی علمی اور فکری گفتگو اور مکالمہ کے دائرے میں داخل ہوں تو اپنے سائلنسر اور ویل چیک کر لیا کریں۔ بس اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں چاہتے۔

؎ شاید کہ اتر جائے ''کسی'' دل میں مری بات

بین الاقوامی قوانین اور اسلامی تعلیمات

[۲۳ ستمبر ۲۰۱۳ء کو اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی کے زیر اہتمام معروف عرب سکالر ڈاکٹر عامر الزمالی کی مرتب کردہ کتاب ''بین الاقوامی قوانین انسانیت اور اسلام'' (مترجم: پروفیسر محمد مشتاق احمد، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد) کی تقریب رونمائی کے موقع پر کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ]

بعد الحمد والصلوٰۃ! ڈاکٹر عامر الزمالی کی کتاب کا اردو ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے جو مختلف اصحابِ علم کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر محمد مشتاق احمد نے انتہائی مہارت اور ذوق کے ساتھ اسے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور آج کے دور کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس پر وہ اور بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ بین الاقوامی قوانین و معاہدات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مطالعہ اور مطابقت و اختلاف کے پہلوؤں کی نشاندہی ہماری اس دور کی اہم ضرورت ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔ ہمارے انتہائی محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں خاصا کام کیا تھا اور اب پروفیسر محمد مشتاق احمد کی اس طرف توجہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ دیگر اصحابِ علم بھی اس طرف متوجہ ہوں۔

مجھ سے قبل جناب خورشید احمد ندیم نے اپنے خطاب میں بین الاقوامی قوانین و معاہدات کے مطالعہ اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے تجزیہ و تحقیق کی ضرورت کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے مطالعہ اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے تجزیہ و تحقیق کی ضرورت کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے مکالمہ و مباحثہ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے اور اسی بات کو آگے بڑھانا چاہوں گا۔ لیکن گفتگو کے آغاز میں دو سال قبل لاہور میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی کے ایک سیمینار کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے بعض چہرے یہاں دکھائی دے رہے ہیں جو اس سیمینار میں بھی موجود تھے، اس لیے یاد دہانی کے طور پر اپنی گزارش کا اعادہ کروں گا۔ میں نے اس سیمینار میں عرض کیا تھا کہ بین الاقوامی معاہدات بالخصوص جنگوں سے متاثرہ افراد دیکھ بھال اور ان کے حقوق و مفادات کے بارے میں وضع کیے گئے قوانین کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ تقابلی مطالعہ بہت بہتر بات ہے اور وقت کی ضرورت ہے، لیکن اگر اس ضرورت کا احساس ان قوانین کی ترتیب اور معاہدات کی تشکیل کے وقت کر لیا جاتا اور اسلام کو ایک زندہ معاشرتی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے معاہدات و قوانین کی تشکیل و تدوین میں اس کے احکام و قوانین کو سامنے رکھا جاتا تو آج کی صورت حال بالکل مختلف ہوتی اور یہ کاوشیں جو آج ہم کر رہے ہیں ان کی نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن اس وقت اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا بلکہ نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر مشکلات پیدا ہو رہی ہیں

اوران کوحل کرنے کے لیے ہمیں اس مکالمہ کی طرف آنا پڑ رہا ہے۔

اس حوالہ سے آج یہ بحث جن نکات کے گرد گھوم رہی ہے وہ یہ ہیں کہ:

☆ کیا آج کے بین الاقوامی معاہدات وقوانین اسلام سے بالکل متصادم ہیں؟

☆ کیا یہ معاہدات وقوانین اسلامی تعلیمات سے مکمل موافقت رکھتے ہیں؟

☆ کیا ان معاہدات وقوانین کی بنیاد اسلامی تصورات پر رکھی گئی ہے؟ اور

☆ کیا ان معاہدات وقوانین کو اسلامی تعلیمات پر یا اسلامی تعلیمات کو معاہدات وقوانین پر برتری حاصل ہے؟

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان نکات کے گرد گھومنے والی یہ ساری بحث محض تکلف ہے اور مفروضات پر مبنی ہے۔ ہمیں مفروضات کے دائرے سے ہٹ کر زمینی حقائق کی روشنی میں ان مسائل پر مکالمہ کرنا ہوگا اور معروضی صورت حال میں پیش آمدہ مشکلات کا حل نکالنا ہوگا۔

میری طالب علمانہ رائے میں آج کے بین الاقوامی معاہدات وقوانین کا پس منظر صرف اور صرف مغربی ہے۔ مغرب میں تاریک صدیوں کے دوران بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کی تکون کے جبر کا شکار ہونے والا معاشرتی ماحول ان معاہدات اور قوانین کا حقیقی پس منظر ہے، جبکہ مسلمانوں کا ایک ہزار سال سے زائد عرصہ کا معاشرتی ماحول اور ان کا تہذیبی پس منظر اس میں قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس وقت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ جس طرح مغربی سوسائٹی مسیحیت کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہوگئی ہے، اسی طرح مسلم سوسائٹی بھی آہستہ آہستہ اپنے دین کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہو جائے گی اور لادینی سوچ پر مبنی نئے فلسفہ ونظام کو سب سے منوانا آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ مغالطہ تھا کیونکہ اسلامی دنیا کو مذہب سے بے گانہ کرنے کے لیے کم وبیش دو صدیوں کی مسلسل منفی محنت کے باوجود مسلمان آج بھی دنیا میں ہر جگہ دین کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ پر قائم ہے اور دینی تعلیمات سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور آج اسلام اور بین الاقوامی معاہدات کے حوالہ سے مکالمہ کی جس ضرورت کا احساس واظہار کیا جا رہا ہے، وہ بھی اسی حقیقت کا غماز ہے۔ اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ جب یہ معاہدات تشکیل پا رہے تھے اور قوانین کی ترتیب قائم کی جا رہی تھی اگر اس وقت اسلام اور مسلمانوں کو نظر انداز نہ کیا جاتا تو صورت حال یہ نہ ہوتی جس سے آج ہم دوچار ہیں۔ مگر اس وقت اسلام اور مسلمانوں کو محض رسمی طور پر ثانوی درجہ میں شریک کار بنانے کا طرز عمل اختیار کیا گیا جس کے نتائج آج سب کے سامنے ہیں۔

ڈاکٹر عامر الزمالی کی اسی کتاب میں شامل جیمس کوکین کے تفصیلی مقالہ کو ایک نظر دیکھ لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو ان معاہدات اور قوانین کی تشکیل وتدوین کے مرحلہ میں کس طرح پس منظر میں رکھنے کی مسلسل کوشش کی گئی۔ مجھے اس کتاب میں وہ مقالہ سب سے زیادہ دلچسپ لگا ہے اور میں نے اسے بغور پڑھا ہے۔ اس موقع پر ریڈ کراس کا کام اور اس کا نشان تک جس انداز میں زیر بحث آیا اور ہلال احمر اور سرخ سورج کے نشانات پر بحث ہوئی، اس کشمکش کا تذکرہ اس کتاب میں بطور خاص پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے باوجود ہم اس بنیادی خلا کی بات

کرتے ہوئے آج یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اسے بالکل ختم کر کے زیرو پوائنٹ پر واپس جایا جائے۔ یہ تو قابل عمل بات نہیں ہوگی مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس خلا کو محسوس کیا جائے اور اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ بین الاقوامی معاہدات وقوانین کی تشکیل میں مسلمانوں کو ان کا حصہ اور کردار نہیں دیا گیا۔ پھر ان حقائق کے اعتراف کے ساتھ اس پورے عمل کا جائزہ لیتے ہوئے باہمی مکالمہ اور مباحثہ کے ذریعہ اس بات کا تعین کیا جائے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور آج کے بین الاقوامی معاہدات وقوانین میں تعارض واختلاف کے نکات کون سے ہیں اور ان پر نظر ثانی کر کے قابل قبول ایڈجسٹمنٹ کا ماحول کیسے قائم کیا جا سکتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم مہاتیر محمد نے جب وہ او۔آئی۔سی کے سربراہ تھے، اقوام متحدہ کی پالیسی سازی کے نظام اور انسانی حقوق کے عالمی چارٹر وغیرہ پر نظر ثانی کی جو بات کی تھی، وہ اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے تھی مگر عالمی ادارے تو رہے ایک طرف، اس تجویز کو خود مسلمان حکومتوں نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔

میں اس سلسلہ میں ایک اور خلا کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ بین الاقوامی معاہدات وقوانین اور اسلامی تعلیمات کے درمیان مکالمہ میں اسلامی تعلیمات کی طرف سے جن لوگوں کو نمائندہ سمجھا جاتا رہا ہے، وہ خود اس کنفیوژن کا ایک بڑا سبب ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنی حکومتوں اور قوموں کی نمائندگی ضرور کر رہے ہوں گے، لیکن انہیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کا نمائندہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ چند سال قبل مسیحیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ کے عالمی سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز اسلام آباد تشریف لائے تو ان کے سامنے مذاکرات اور مکالمہ کے لیے جناب شوکت عزیز تشریف فرما تھے۔ میں نے اس وقت بھی یہ سوال اٹھایا تھا کہ آرچ بشپ آف کنٹربری تو پروٹسٹنٹ مسیحیوں کی نمائندگی کر رہے ہیں، یہ شوکت عزیز صاحب مسلمانوں کے کون سے مکتب فکر کے نمائندہ ہیں؟ چنانچہ ہمارے ساتھ یہ دھاندلی بھی ہو رہی ہے۔

اس لیے میں ڈاکٹر عامر الزمالی کی اس کتاب اور بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی کی طرف سے ان معاہدات وقوانین کے حوالہ سے مکالمہ کی ضرورت کے احساس وادراک کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس کتاب کی اشاعت کو اس سلسلہ میں ایک اہم پیش رفت سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ گزارش کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مکالمہ کا فائدہ اسی صورت میں ہوگا جب ہم مفروضات کے دائروں سے نکل کر معروضی صورت حال، تاریخی پس منظر اور زمینی حقائق کی بنیاد پر حقیقت پسندی کے ساتھ اس مکالمہ اور تحقیق کو آگے بڑھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمت کام کرنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

نفاذ اسلام کے لیے مسلح جدوجہد کا راستہ

گزشتہ دنوں بعض عسکریت پسند گروہوں کی طرف سے اس مضمون کے بیانات اخبارات میں شائع ہوئے کہ حکومت پاکستان طالبان کے ساتھ مذاکرات کے لیے آئین کی بات کرتی ہے جبکہ ہم شریعت کی بات کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بہت سے عسکریت پسند گروپوں کے نزدیک دستور پاکستان اور شریعت اسلامیہ ایک دوسرے کے مد

مقابل اور حریف ہیں جبکہ یہ خیال درست نہیں ہے اور اس مغالطے کو فوری طور پر دور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

دستور پاکستان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ شریعت اسلامیہ سے متصادم ہے، دستور پاکستان سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ اس لیے کہ دستور پاکستان کی بنیاد عوام کی حاکمیت اعلیٰ کے مغربی جمہوری تصور پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اسلامی تصور پر ہے جس پر دستور کی بہت سی دفعات شاہد و ناطق ہیں۔ دستور پر عمل نہ ہونا یا اس بارے میں رولنگ کلاس کی دوغلی پالیسی ضرور ایک اہم مسئلہ ہے لیکن اس سے دستور کی اسلامی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا اصول ہے کہ کوئی شخص کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے اور دینی مسلمات میں سے کسی بات سے انکار نہ کرے تو اس کی بے عملی یا بدعملی کی وجہ سے اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا اور وہ فاسق و فاجر کہلانے کے باوجود مسلمان ہی شمار ہوگا۔ اس لیے رولنگ کلاس کی بے عملی یا دوغلے پن کی وجہ سے دستور کو غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ دستور اس وقت پاکستان کی وحدت کی اساس ہے، خدانخواستہ اس دستور کی نفی کر دی جائے تو ملک کو متحد رکھنے کی اور کوئی بنیاد باقی نہیں رہے گی اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وحدت و سالمیت کو خدانخواستہ داؤ پر لگانے کا کسی مسلمان کو رسک نہیں لینا چاہیے۔

جبکہ تیسری گزارش ہم یہ کرنا چاہیں گے کہ اس دستور کی تشکیل و تدوین میں ملک کی تمام دینی و سیاسی قوتیں شریک رہی ہیں اور اب بھی وہ اس پر متحد و متفق ہیں۔ یہ دستور جب 1973ء کے دوران ترتیب دیا جا رہا تھا اس وقت اسے مرتب و مدون کرنے میں دوسرے بہت سے قومی راہ نماؤں کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے طور پر حضرت مولانا عبد الحقؒ آف اکوڑہ خٹک، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا نعمت اللہؒ آف کوہاٹ، حضرت مولانا صدر الشہیدؒ آف بنوں، حضرت مولانا عبد الحکیم ہزارویؒ اور حضرت مولانا عبد الحقؒ آف کوئٹہ بھی شامل تھے اور ان سب بزرگوں کے اس پر دستخط ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس وقت عسکریت پسندوں کی بہت بڑی اکثریت ان میں سے کسی نہ کسی بزرگ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد ہے، اس لیے انہیں اپنے ان عظیم المرتبت اساتذہ کے موقف سے انحراف اور ان کی کاوشوں کی نفی کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے اور **البرکۃ مع اکابرکم** کا خیال رکھتے ہوئے دستور پاکستان کی پاسداری کا واضح اعلان کرنا چاہیے۔

ہم متعدد بار یہ لکھ چکے ہیں کہ ایک مسلمان ریاست میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا جسے فقہی اصطلاح میں ''خروج'' کہتے ہیں، حکمرانوں کی طرف سے ''کفر بواح'' یعنی کھلے کفر کے اعلان کے سوا شرعاً جائز نہیں ہے اور جب تک ہمارا کوئی حکمران گروہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظریاتی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں سے خدانخواستہ صراحتاً انکار نہیں کرتا، اس پر ''کفر بواح'' کا فتویٰ لگا دینا درست نہیں ہے بلکہ اگر ''خروج'' کے جواز کا کسی درجہ میں ماحول دکھائی دیتا ہو تو بھی اس کے قابل عمل ہونے کو فقہائے احناف نے جواز کی شرائط میں شامل کیا ہے، کیونکہ قابل عمل ہونے کے غالب امکان کے بغیر حنفی فقہاء کسی مسلم حکومت کے خلاف خروج کو بعض دوسری شرائط کے پائے جانے کے باوجود شرعاً درست قرار نہیں دیتے۔ جبکہ پاکستان کے معروضی حالات میں اس کا کسی درجہ میں کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی مسلح گروہ ملک کے

کسی حصے پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر سکے اور اس میں اپنی مرضی کا نظام نافذ کر لے۔ اس لیے ہم نے نفاذِ شریعت کے خواہش مند اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والے مسلح عناصر سے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کر کے پُرامن جدوجہد کا طریق کار اختیار کریں اور اس کے لیے جمہور علماء امت کو اعتماد میں لیں۔

ہمارے نزدیک نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا اصل راستہ وہی ہے جو ہمارے بزرگوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی مالٹا کی قید سے واپسی پر ان کی راہ نمائی میں اختیار کیا تھا اور آزادی کی جدوجہد کے لیے پُرامن عوامی سیاسی تحریک کے ذریعہ برطانوی استعمار کے خلاف عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کی صبر آزما محنت کر کے اسے یہاں سے رخصت ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ تحریک خلافت، جمعیۃ علماء ہند، مسلم لیگ اور مجلس احرار اسلام کی تحریکات اس کی زندۂ جاوید تاریخی شہادتیں ہیں اور ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ہم نہ مسلح جدوجہد کے طریق کار کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی صرف الیکشن پر قناعت کرنے کو نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا درست طریق کار سمجھتے ہیں۔ نفاذِ اسلام کے لیے بین الاقوامی اور ملکی اسٹیبلیشمنٹ کے منافقانہ کردار اور دوغلے رویے کے خلاف شدید عوامی مزاحمت درکار ہے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے، البتہ یہ مزاحمت اسلحہ اور ہتھیار کی بجائے اسٹریٹ پاور، سول سوسائٹی، پرامن عوامی تحریک اور منظم احتجاجی قوت کے ذریعہ ہونی چاہیے۔

قبائلی علاقہ جات کی کالعدم تحریک طالبان سمیت بہت سے دیگر دینی حلقوں کو یہ شکوہ ہے کہ ملک کے جمہور علماء ان کی دینی جدوجہد میں ان کا ساتھ نہیں دے رہے، جبکہ ہمارا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ راقم الحروف کو بھی تحریکی دنیا کا کارکن سمجھا جاتا ہے، درجنوں تحریکوں میں مختلف سطحوں پر متحرک کردار ادا کرنے کی سعادت بحمد اللہ تعالیٰ حاصل کر چکا ہوں اور اسے اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہوں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ دینی جدوجہد کے جس مرحلہ میں بھی جمہور علماء کرام اور ان کی علمی وفکری قیادتوں کو اعتماد میں لے کر ان کی مشاورت سے کسی تحریک کا پروگرام طے کیا گیا ہے، جمہور علماء بلکہ عوام نے بھی کبھی مایوس نہیں کیا۔ تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیٰؐ اور شریعت بل کی تحریکات اس پر شاہد ہیں، البتہ ملک کے کسی بھی دینی طبقہ اور جماعت نے کسی بھی دینی جدوجہد کا پروگرام اگر از خود طے کیا ہے، اس کے اہداف، ترجیحات اور طریق کار کے تعین میں جمہور علماء کی قیادتوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سب کچھ از خود طے کر کے جمہور علماء کو اپنے پیچھے چلنے کی دعوت دی ہے تو اسے بہرحال مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور یہ ایک فطری بات ہے، اس لیے کہ اگر جمہور علماء دینی جدوجہد کے عنوان سے ہر آواز کی طرف لپکنا شروع کر دیں تو ملک کے عمومی دینی ماحول کی رہی سہی اجتماعیت بھی داؤ پر لگ جائے گی جو کسی طور بھی دین اور ملک وقوم کے مفاد میں نہیں ہے۔

ہمیں دین کے لیے کسی بھی حوالہ سے جدوجہد کرنے والوں کے خلوص، قربانیوں اور سعی ومحنت سے انکار نہیں ہے، لیکن ملک کے عمومی دینی ماحول کا تعاون حاصل کرنے کے لیے جمہور علماء کرام بلکہ مختلف مکاتب فکر کی دینی، علمی اور فکری قیادتوں کو جدوجہد کے مقاصد، ترجیحات اور طریق کار کے بارے میں اگر اعتماد میں نہیں لیا جائے گا تو ان سے عدم تعاون کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہوگا۔